رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۸۱

رجسٹرڈ انگلشیہ نمبر

نمبر [?] بنیاد حیدرآباد دکن

ہفتہ وار

مملکت

ایڈیٹر
میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

شرح چندہ
سالانہ .... ے
ششماہی .... ہے
سہ ماہی .... عا

شرح چندہ
سالانہ .... ے
ششماہی .... ہے
سہ ماہی .... عا

قیمت فی پرچہ ۲ را

قیمت پرانا پرچہ ۴ ر

جلد ۵	۲۲ آذر ۱۳۵۵ ف	۳۰ ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ	۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء شنبہ	نمبر ۲۸

پنڈت نہرو کی اشتراکیت

از

پروفیسر جی 'ڈی' پارک

قوم پرست پنڈت نہرو اب اشتراکیت کی طرف رجوع ہو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ملک کی آئندہ معاشی ترقی سے متعلق چند خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ خیالات بیشتر پلان سے ماخوذ ہیں۔ پنڈت نہرو نے جو قومیت کے پرشد داور [illegible] صورت کے علمبردار ہیں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ زمینداری کو ختم کر دیا جائے اور زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے اجتماعی کاشت کو رواج دیا جائے۔ ان کی یہ رائے بھی ہے کہ کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیا جائے اور صنعتوں پر بہ حیثیت مجموعی حکومت کی نگرانی قائم کی جائے۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو کا یہ اعلان کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے فوری بعد شائع ہوا۔ مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان مسائل کی نسبت سکوت اختیار کیا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس نے آزادی کے سیاسی اور معاشی مضمرات کی وضاحت سے بھی گریز کیا۔ اس موقع پر کانگریسی لیڈروں اور خود پنڈت نہرو نے جو تقریریں کیں ان میں ان مسائل کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر پنڈت نہرو کا واقعی یہ ایقان ہے کہ ملک میں اشتراکی فضا پیدا کی جائے تو وہ ان خیالات کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرکے اس کی توثیق حاصل کرسکتے تھے مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کیا ان خیالات کا اظہار محض الکشن میں ووٹ حاصل کرنا تو نہیں؟ کانگریس کی فضا اشتراکیت کے لئے موزوں نہیں۔ سرمایہ دار اور زمیندار کانگریس کی سرپرستی کرتے ہیں لہذا اشتراکی فضا ان کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ اور ان کی صحت کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری کانگریس نے اپنے سر لی ہے۔ کیا کانگریس کے فوق الصدر نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ نہیں کہا کہ امیروں کو اور زیادہ امیر ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھنے کے لئے ان کو حسب ضرورت روپیہ دے سکیں۔ کانگریس اور اعلے طبقے کے مٹھی بھر افراد کا تعلق اس قدر نمایاں ہو چکا ہے کہ اب کوئی شخص پنڈت نہرو کے اشتراکی خیالات کو اہمیت دینے تیار نہیں۔ جب پنڈت نہرو آگسٹ کی بغاوت پر تقریر کرتے ہیں تو انہیں ایک ہیرو کہا جاتا ہے اور جب وہ اشتراکیت کا راگ الاپتے ہیں تو لوگ اس کو ان کے شخصی خیالات سے تعبیر کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پنڈت نہرو کے ذہنی تموج کو کانگریس کی پالیسی تصور کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جس وقت سرت چندر بوس نے [?] کو ایشیا کا سب سے بڑا فسطائی کہا تھا تو کانگریس نے سرت بوس کے بیانات سے اپنے آپ کو بے تعلق کر لیا اور کہا کہ یہ سرت بوس کے شخصی خیالات ہیں۔ جب پنڈت نہرو ایک ایسے ادارہ میں جس کی نشو و نما میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کا بڑا حصہ رہا ہے زمینداری کو ختم کرنے اور صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کو بھی پنڈت نہرو کے شخصی خیالات سے تعبیر کیا جائے گا۔ پنڈت نہرو کے ان نعروں کا مقصد صرف عوام کو ووٹ حاصل کرنے کے لئے دھوکے میں رکھنا ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ ان اشتراکی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کانگریس کے وسائل اور قوت کو استعمال کیا جائے۔ یہ اشتراکی خیالات کبھی کانگریس کی قراردادوں میں ظاہر نہیں آئیں گے بلکہ صرف لیڈروں کی زبان سے ادا ہوتے رہیں گے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے پہلے کانگریس کی نیشنل پلاننگ کمیٹی کا جلسہ بمبئی میں پنڈت نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بمبئی پلان کے دو مرتب بطور خاص اس جلسہ میں شرکت کے لئے مدعو کئے گئے تھے اور دو تو پہلے ہی سے اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ نیشنل پلاننگ کمیٹی کے اجلاس نے یہ رائے ظاہر کرتے ہوئے کہ کافی مواد کی عدم موجودگی میں منصوبہ بندی دشوار ہے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ متعدد سوالات پر غور کرے جو کمیٹی کے اجلاس میں پیش کئے گئے تھے۔ اس کمیٹی کے ارکان پر غور کیجئے تو ارکان میں سے چار ارکان سرمایہ دار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ارکان سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ پنڈت نہرو جیسے اشتراکیت پسند کی رہنمائی میں ملک کی آئندہ معاشی زندگی سے متعلق منصوبہ بندی کریں گے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے اشتراکی خیالات نیشنل پلاننگ کمیٹی کے اجلاس میں پیش نہیں کئے۔ ان خیالات کا اظہار صرف ووٹ حاصل کرنا ہے۔

دو سال پہلے بھی پنڈت جی نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس پلان کے سامنے [illegible] اشتراکیت [illegible] اور ان نعروں کے ذریعہ کانگریس کے لئے ووٹ حاصل کرنے

بقیہ ملاحظہ صفحہ ۱۲

مملکت ہفتہ وار

۲۲ آذر ۱۳۵۵ ف

شہری آزادیاں یا امن سوزی؟

چند روز سے بعض ہندی معاصرین کے صفحات پر شہری آزادیوں سے متعلق بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تحریر، تقریر اور اجتماع کی آزادی ہر شہری کا پیدائشی حق ہے۔ مگر اس نظریہ کو پیش کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ مثلاً ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق ہے مگر اس کے بالمقابل اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی کا احترام کرے۔ ہر شخص کو وسائل حیات سے مستفید ہونے کا حق ہے مگر ساتھ ہی اس پر یہ فرض بھی ہے کہ وہ دوسروں کے وسائل حیات میں دست اندازی نہ کرے۔ ہر شخص کو راستہ چلنے کا حق ہے اور اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا راستہ نہ روکے۔ ہر شہری کو تقریر کرنے کی آزادی ہے مگر اس پر یہ فرض بھی عائد ہے کہ اس کی تقریر امن سوزی کا باعث نہ بنے۔ مگر جب یہ طالبان آزادی حقوق کا مطالبہ تو کرتے ہیں مگر فرض کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

گزشتہ بیس سال کے دوران میں ان طالبان آزادی نے ملک میں فرقہ واری فضا پیدا کر کے جس طرح ہنگاموں اور فسادات کا باعث ہوئے ہیں وہ ایک طویل داستان ہے جس سے اہل ملک بے خبر نہیں ہیں۔ ان کا سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ حکومت مسلمانوں کی ہے اور ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتی ہے اس الزام کی تائید میں جب وہ ٹھوس واقعات پیش نہ کر سکتے تو اس گشتی کا حوالہ دیتے تھے جو مساجد کے آگے باجا بجانے سے متعلق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس گشتی کے نفاذ کا مقصد ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں مداخلت نہیں بلکہ ایک ایسے ملک میں جہاں ایک سے زیادہ فرقے آباد ہوں امن وامان قائم رکھنا ہے۔ اسی طرح دوسری گشتیاں بھی جو جلوس اور جلسوں سے متعلق نافذ ہوئیں ان کا مقصد بھی امن وامان برقرار رکھنا اور فسادات کو روکنا ہے۔ ان گشتیوں کے نفاذ کا باعث بھی یہی نام نہاد لیڈر ہوئے۔ جو شہری آزادیوں کا بیجا استعمال کر کے امن سوزی کا باعث ہوتے تھے۔ یہ لیڈر آزادی کے نام سے بے راہ روی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ بیس سال کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اصحاب جو شہری آزادیوں کے طالب ہیں ان آزادیوں کو مسلمانوں کے متعلق جذبات نفرت وحقارت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں مسلمین سے واقعی کوئی بیر یا عناد ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طریقہ سے حکومت کے خلاف ایک زبردست محاذ تیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ حکومت مرعوب ہو کر ہندو سرمایہ داروں کے لئے اپنی جگہ خالی کر دے۔ یا بصورت دیگر ملک کی غیر مسلم اکثریت کو حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا جا سکے۔ گزشتہ بیس سالہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ان طالبان آزادی نے جب کبھی زبان کھولی تو مذہب اسلام پر رکیک حملے شروع کر دئے۔ مسلمانوں اور حکومت کو مترادف ظاہر کر کے بعض حکام کی بداعمالیوں کو ساری مسلم قوم سے منسوب کیا۔ ذات شاہانہ کا تذکرہ بعض دفعہ ایسے انداز میں کیا گیا جو ایک حیدرآبادی کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ حکومت کے خلاف بے بنیاد اور بے سروپا الزامات عائد کئے گئے اور حقائق کا اخفا کیا گیا۔ بیرونی تحریکات کو حیدرآباد کی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ غرض ہر وہ حرکت کی گئی جو بدامنی اور انتشار پیدا کرنے کا باعث ہو۔ ان ساری کوششوں کے پیچھے یہ توقع کارفرما تھی کہ ان شورش پسندوں کو حکومت اپنے محکموں میں جگہ دے گی۔

مذہبی آزادیوں کے نام سے مسلح جلوس نکالے جاتے ہیں جن میں اشتعال انگیز نعرے لگائے جاتے ہیں اور امن سوز گیت گائے جاتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں نہ مذہبی زندگی کا جزو اعظم ہیں۔ قدیم زمانہ سے ہندو مذہبی جلوسوں میں جدت طرازی کی کوشش ہوتی ہیں۔ ان کا ذہنی استدلال یہ تھا کہ اگر ہم کسی نئے راستے سے جلوس نکالنے کی اجازت حاصل کر لیں تو ایسی اجازت سے مسلمانوں پر اپنا رعب جما سکیں گے اور اگر اجازت نہ ملے تو حکومت کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا موقع پیدا ہو جائے گا اور یہ شور مچایا جا سکے گا کہ حکومت ہندو مذہب کو کچلنا چاہتی ہے۔ غرض ان سستے اور عامیانہ طریقوں سے امن پسند عوام کے جذبات کو ہیجان میں لا کر انہیں اپنے سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے آلۂ کار بنانا ان عوام فریب لیڈروں کا مطمح نظر ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد لیڈر واقعی عوام کے نمائندہ اور ان کے ترجمان ہیں یا سرمایہ داروں کے ایجنٹ۔ اگر ان لیڈروں کی ان سرگرمیوں پر نظر ڈالی جائے جو اجناس خوردنی کی قلت اور گرانی کے اس زمانہ میں رونما ہوئی ہیں تو ان کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ جس وقت حکومت سرکار عالی کاشتکاروں کی فلاح وبہبود کی خاطر قانون بصالحت قرضہ اور قانون انسداد سود گراں وغیرہ نافذ کر رہی تھی ہمارے ان لیڈران قوم نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف تحقیق اور طالب طور پر مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ جب حکومت نے دیکھا کہ کاشتکاروں کی اراضی سودی قرضوں کی بدولت ساہوکاروں کے قبضہ میں چلی جا رہی ہے اور کاشتکار کی حیثیت محض ایک مزدور کی ہوتی جا رہی ہے تو اس نے قانون انتقال اراضی نافذ کیا اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس قانون کی مخالفت میں ان لیڈروں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جو دن رات کاشتکاروں کی فلاح وبہبود کا دم بھرتے ہیں اور شہری آزادیوں کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اصلاح وترقی اور منصفانہ اصول پر سماج کی تنظیم جدید سے متعلق جو تحریک بھی پیش ہوتی اس کی مخالفت ان اداروں اور افراد کی جانب سے ضروری تھی جو ساہوکاروں اور زمینداروں کے زیر اثر ہیں۔ ایک جانب عوام کی نمائندگی کا دعویٰ، شہری آزادیوں اور جمہوری دستور کا مطالبہ اور دوسری جانب ایسی تجاویز کی مخالفت جو عوام کی بھلائی کے لئے پیش کی جائیں ان عوام فریب لیڈروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دوران جنگ میں جب عوام اشیائے ضروریہ کی قلت اور گرانی کی وجہ سے مصائب میں مبتلا تھے ان لیڈروں نے جو اپنے آپ کو عوام پسند اور عوام کے دوست ظاہر کرتے ہیں غذائی صورت حال کو بہتر بنانا تو کجا ایک ایسا بیان تک جاری کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس میں ذخیرہ اندوزوں اور نفع اندوزوں کے خلاف

عوام کو مشتعل کیا جاتا اور ان خود غرضوں کو ان کی ہوس نفع اندوزی کا مزہ چکھایا جاتا۔ شہر میں کہیں کہیں بے سر و پا اشتہار تقسیم کئے گئے بلکہ ان سرمایہ داروں کی واقفیت میں تقریریں کی گئیں اور بیانات جاری کئے گئے۔ البتہ ان تقاریر اور بیانات میں فاقہ کش عوام کی ہمدردی کا رنگ ضرور لایا گیا۔ غریب اور مفلس عوام کی ہمدردی کا دم بھرنے والے ان لیڈروں سے سوال ہے جو اچھی طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ غذائی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کی گرفتاریاں کی گئی تھیں اور ان کو قانون کی زد سے بچانے کے لئے پیروی کی گئی تھی تو کیوں غذائی صورت حال کو اس غرض سے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت کو پریشان اور تنگ کر کے اپنے سیاسی اور فرقہ وارانہ اغراض کی تکمیل کی جائے۔ اپنی قدیم عادت اور مسلمہ روایت کے مطابق یہ عوامیت پسند لیڈر اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے دروغ گوئی، افترا پردازی اور شر انگیزی کے فرسودہ اور بازاری ہتھیاروں کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہی لیڈر اب شہری آزادیوں کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں۔ یہی لیڈر اب ذمہ دار حکومت بنانا چاہتے ہیں۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ آزادی تحریر و تقریر اور آزادی اجتماع کے سچے خواہش مند اور ان آزادیوں کا صحیح استعمال کرنے والے ملک میں اور ہندو جماعت میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ایسا اعلیٰ نصب العین رکھنے والے افراد کی قلت ہے۔ اور اگر ایسے کچھ ہیں بھی تو وہ اشتراکی جماعت میں شامل نہیں کیونکہ یہ جماعت فرقہ واریت سے اصولاً دور ہے۔ حال ہی میں ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی وہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ حیدرآباد میں شہری آزادیاں موجود ہیں۔ ہر سال وسیع پیمانہ پر سیاسی اور مذہبی جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ آریہ سماجیوں کے جلسے نہ صرف شہروں میں بلکہ محلوں میں ہوتے ہیں، ہر جگہ منڈل کے جلسے ہوتے ہیں۔ ایک نہیں دو دو تین تین کانفرنسوں کے جلسے ہوتے ہیں مہاراشٹرا پریشد، کرناٹک کانفرنس، اتحاد المسلمین کانفرنس دوسری جماعتیں ہیں جو جلسہ ہائے عام منعقد کرکے ملک کی فضا کو بگاڑنے کا کام نہیں کر رہی ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ جلسہ ہائے عام کے انعقاد پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں بلکہ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی جذبات کو ہوا دے کر فرقہ وارانہ مناقشات کو ابھارنے اور ملک کے امن کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے جو کارروائیاں کی جارہی ہیں انہیں کس طرح روکا جائے۔ ان پر کس طرح قابو پایا جائے اور عوام کے رجحانات کو صحیح راستہ پر کس طرح لگایا جائے؟

ہم ہر اس تحریک کے لئے ہر قسم کی آزادی
— تحریر، تقریر اور اجتماع —
پسند کریں گے جو افتراق و نفاق کے بجائے اتفاق و اتحاد کا سبق دیتی ہو، جو مختلف مذاہب عالم کا احترام سکھاتی ہو اور جو انسانیت کے بنیادی حقوق سیاسی ہوں اور معاشی ہوں انسانیت کے لئے حاصل کرنا چاہتی ہو، جو طبقہ وار اور فرقہ وارانہ کشمکش سے بالاتر ہو۔ مثال کے طور پر ہم ایک خالص اشتراکی پروگرام کو — بشرطیکہ وہ ہندو اکثریت کی جارحانہ فرقہ واریت کے لئے آلۂ کار ثابت نہ ہو یا سرمایہ داروں کے مفاد کا سودا نہ ہو — ہر قسم کی آزادی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس کے پرچار کو ملک کے لئے فال نیک تصور کرتے ہیں حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اشتراکی پروگرام ان سرمایہ دارانہ پروگراموں کے مقابلہ میں جو آندھرا مہاسبھا، مہاراشٹرا اور کرناٹک کانفرنس کے نام سے مشہور ہیں زیادہ انقلابی اور زیادہ دور رس نتائج کا حامل ہے۔ ہماری اس پسند کی وجہ صرف یہ ہے کہ اشتراکیت میں فرقہ واریت کی کوئی جگہ نہیں۔ اس کے برخلاف آریہ سماج، ہندو مہاسبھا، آندھرا کانفرنس، مہاراشٹرا پریشد، کرناٹک کانفرنس اور اتحاد المسلمین وغیرہ یہ سب خالص فرقہ واری تحریکات ہیں جن کا کام یہ ہے کہ اپنے ہوئے ہمارے متوطنین کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرکے ایک چھوٹی سی جماعت کے سیاسی اور معاشی مقاصد حاصل کئے جائیں۔ ہم ایسی آزادی کو ملک کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ ہم ہر اس تحریک کے حامی ہیں جو غیر فرقہ وارانہ ہو اور جس کا مقصد غریبوں کے معیار زندگی کو بلند کرنا اور عوام الناس کو ایک آزاد، باعزت اور خوش حال مستقبل کی ضمانت دینا ہو۔

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس

ترقی پسند ادب سے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند مصنفین نے اپنے مقاصد اور عزائم کو جیسا چاہئے عام نہیں کیا۔ گزشتہ ہفتہ حیدرآباد میں جو کانفرنس ترقی پسند مصنفین نے منعقد کی تھی اس کی تقاریر اور قراردادوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایسا ادب پیدا کیا جائے جو زندگی سے قریب تر ہو اور اپنے اندر افادی پہلو رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا بلکہ اس تحریک کی تائید سب کا فرض ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر صاحب کا خطبہ صدارت بجائے خود ترقی پسند ادب کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔

اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ بڑی کاوش اور غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ اقبال کے ناقدین سے متعلق علی سردار جعفری کی تنقید، اردو ادب کی تاریخ سے متعلق سبط حسن کا مقالہ، ہندی، اردو اور ہندوستانی سے متعلق سجاد ظہیر کا مقالہ، مخدوم (محی الدین)، ڈاکٹر تارا چند کا خطبۂ صدارت، اردو نثر سے متعلق پروفیسر احتشام حسین کا خطبۂ صدارت وغیرہ ایسے ادبی مسائل ہیں جن کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حیدرآباد کے ترقی پسند گروہ کی وہ کوشش جو کانفرنس کی صورت میں رونما ہوئی بحیثیت مجموعی کامیاب رہی۔ ہم اپنے ان ترقی پسند دوستوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے اندر وسعت نظر اور رواداری کے جذبات کو نشو و نما پانے کا موقع دیں تاکہ وہ ہر اس شخص کو جو ترقی پسند گروہ سے تعلق نہیں رکھتا رجعت پسند نہ سمجھیں۔ اگر ترقی پسند اصحاب اس مغالطے سے بچے رہیں تو ان کی تحریک کو یقیناً تقویت حاصل ہوگی۔

اُردو شاعری کی خدمت

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ اردو شاعری کا ایک جامع انتخاب ترتیب خاص بنام سلسلہ منتخبات نظم اردو ۱۹۲۹ء سے شائع ہونا شروع ہوا، اور اس کے تین عنوان مستقل قرار پائے۔

۱۔ معارف ملت۔ جلد اول، دوم، سوم، چہارم
۲۔ جذبات فطرت۔ " " " "
۳۔ مناظر قدرت " " " "

ہر عنوان کے تحت چار چار جلدیں چار سال میں ۱۹۳۲ء تک شائع ہوئیں۔ جو بارہ (۱۲) جلدوں میں دو سو قدیم و جدید شعراء کا کلام تقریباً چودہ سو نظموں کی شکل میں کم و بیش دو ہزار صفحات پر جمع ہو گیا۔ جو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بیحد قابل قدر ہو گیا۔ چنانچہ سلسلہ مذکور کو علمی و ادبی حلقوں میں، تعلیمات و جامعات میں اور عام طبقات میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے اور نکل رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر سال پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہوتے ہیں حالانکہ تجارتی معمولی کے پیمانہ پر اس سلسلہ کا اشتہار کبھی نہیں نکلا۔ پہلے اشاعت کا مرکز مسلم یونیورسٹی علیگڑھ رہا۔ چند سال سے اس کی اشاعت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلق سے مکتبہ جامعہ دہلی کے سپرد ہے۔

اردو میں ماشاء اللہ جس تیزی کی تعداد جس پیمانہ پر ترقی کر رہی ہے اس سے اردو ادب کا شاندار مستقبل نظر آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت کچھ قابل قدر کلام شائع ہو چکا ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

غذا کے مسائل

مولوی رضی الدین احمد صاحب معتمد رسد کی نشری تقریر

اہل ہند میں یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کہ دوران جنگ ایک زرعی ملک ہونے کے باوجود غذائی نقطۂ نظر سے خود مکتفی نہیں ہے ایک عالمگیر جنگ درکار ہوئی۔ گزشتہ دو تین سال کی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد تب یہ پتہ چلا کہ ہندوستان کی آبادی کا قابل لحاظ حصہ بعض اوقات فاقے کرتے اور بعض اوقات آدھا پیٹ کھا کر اپنی زندگی کے دن گذارتا ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے اہم یہ ہے کہ غذائی پیداوار ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اکثریت کی قوت خرید اس درجہ محدود ہے کہ غذا جیسی اہم ضرورت زندگی کی تکمیل کے لئے بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو دوران جنگ ہی میں ہماری توجہ کا مرکز بنا اور وہ یہ کہ جو غذا ہماری اکثریت کو میسر نہیں آتی ہے وہ باعتبار غذائیت ناقص ہے [illegible] اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے جس قسم کی غذا درکار ہے وہ اسے میسر نہیں۔ ماہرین اغذیہ نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک بالغ انسان کی روزمرہ غذا کن اجزا پر مشتمل ہونی چاہئے۔ لیکن ان اجزاء سے اکثر صورتوں میں ہماری عادتی غذا معرا ہے۔

اس لئے ہمارا غذائی مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ کافی مقدار میں غذا پیدا کی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ کافی مقدار میں صحیح قسم کی غذا اچھی قیمت پر فراہم کی جائے جس کو آبادی کی اکثریت خرید سکے۔ بالفاظ دیگر غذائی پیداوار کی منصوبہ بندی اور عوام کی قوت خرید میں اضافہ ساتھ ساتھ ہو تو غذائی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

کیا بدقسمتی ہے کہ یہاں (۴۰) کروڑ انسان بستے ہیں جن میں سے تقریباً (۳۰) کروڑ دیہات میں بستے ہیں اور (۲۵) کروڑ سے کوئی (۷۰) فیصد کسی نہ کسی طرح کاشتکاری سے متعلق ہیں لیکن وہ اتنی بھی غذا پیدا نہیں کر سکتے کہ ہم سب اپنا پیٹ بھر سکیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ناگہانی و خشک سالی [illegible] بنگال سے ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ بنگال کے اکثر دیہاتیوں کو اس قدر کم غذا ملتی ہے کہ شاید ہی وہ بمشکل اس پر زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں اس کا نتیجہ دنیا نے سنہ ۱۹۴۳ء کے قحط میں دیکھا جس میں کہا جاتا ہے کہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ انسان فاقہ کشی کی وجہ موت کا شکار ہو گئے۔

ہندوستان کے مسائل اغذیہ سے ہٹ کر صرف حیدرآباد کی حد تک اگر ہم اس مسئلہ پر نظر ڈالیں تو شاید موجودہ مشکلات کے اسباب سمجھنے میں سہولت ہو۔ حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ جہاں تک غذا کا تعلق ہے یہ ملک نہ صرف خود مکتفی ہے بلکہ بعض اشیا مثلاً جوار باجرہ اور زیادہ مقدار میں دالیں برآمد کرنے کے بھی قابل ہے۔ چاول اور گیہوں کی کمی ہے جو ہمیشہ سے باہر سے آتے ہیں۔ برما کے چاول کی درآمد رک جانے کی وجہ سے ہندوستان میں اس کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ جہاں حیدرآباد میں (۷۰) سے (۸۰) ہزار ٹن یا تقریباً چھ سات لاکھ پلے چاول منگوایا جاتا تھا اس کے مقابلہ میں اس کی ایک چوتھائی مقدار کا بھی ملنا دشوار تھا۔ جو بھی غذا سارے ہندوستان میں پیدا کی جاتی ہے یا درآمد کی جا سکتی اس کی تقسیم تمام صوبوں میں ضروری تھی اس سے کوئی ایسی کسی جگہ اپنی نہیں بنائی جا سکتی جو تمام ہندوستان کی عام پالیسی سے جدا ہو۔ اگر ہندوستان کے کسی حصہ میں فاقہ کشی ہو تو فطرتاً سارے ہندوستان کے لئے باعث تکلیف ہوگا۔

حیدرآباد کی حد تک اہم مسئلہ زیادہ تر یہ ہے کہ غرباء کو جن کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ گراں قیمتوں پر اشیائے خوردنی خرید سکیں۔ واجبی داموں پر اناج ملے اور دوسرے علاقہ جات میں جہاں بارش وغیرہ کی کمی کی وجہ فصول متاثر ہوئی ہوں اتنا غلہ پہنچایا جائے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ایک اور پہلو اس مسئلہ کا یہ ہے کہ بعض اضلاع میں جہاں غذائی اجناس کے تحت رقبہ میں کافی کمی کر دی گئی اور غیر غذائی اجناس کی کاشت کو زیادہ فروغ دیا گیا ہے وہاں کمی غلہ کو دور کیا جائے۔ ہمارے موجودہ اور فوری توجہ کے قابل جو امور ہیں وہ یہی ہو سکتے ہیں کہ قیمتوں پر نگرانی رکھی جائے اور اس کی پوری پوری پابندی کرائی جائے۔ مواضعات سے غذائی اجناس خریدی جائیں شہروں اور قصبات میں ان کو تقسیم کیا جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر بتلایا ہے ہم صرف اپنی ہی ضروریات کا انتظام کر کے خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم اپنی ساری ضروریات کی تکمیل کے بعد کچھ دے سکتے ہیں تو ہمیں ضرور باہر کے ایسے علاقوں کی جن کو غذا کی ضرورت ہے مدد کرنی چاہئے۔

سب سے پہلے قیمتوں کی نگرانی کو لیجئے۔ خواہ آپ کتنی ہی نیک نیتی سے قیمتیں مقرر کریں اور کتنی ہی کڑی نگرانی رکھنے کی کوشش کریں، اس وقت تک اس میں کامیابی ممکن نہیں ہے جب تک خود آپ کے ہاں اتنے ذخائر موجود نہ ہوں کہ اگر مقررہ قیمتوں پر غلہ بازار میں فروخت نہ ہو تو آپ خود لوگوں کی ضروریات ان قیمتوں پر پوری کر سکیں۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ رسد کی کمی کے زمانہ میں جیسے ہی قیمتوں پر تحدید عائد کی جاتی ہے اشیاء بازاروں سے غائب ہونی شروع ہو جاتی ہیں اور بجائے مصیبتوں کو دور کرنے کے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان حالات میں غلہ کی فراہمی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں کرنا پڑتا کہ جہاں غلہ زیادہ پیدا کیا جاتا ہے وہاں خرید کر کمی والے علاقوں میں پہنچایا جائے۔ بعض اضلاع ایسے ہیں جہاں تمام غذائی اجناس ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض ایسے ہیں جہاں کچھ ضرورت سے زیادہ ہیں اور کچھ کی کمی ہے اور بعض ایسے علاقے ہیں جہاں ہر چیز کی کمی ہے۔ اس لئے سب سے بہتر شکل یہ ہوگی کہ جس قدر پیداوار کسی ملک میں ہو وہ پوری پوری حاصل کی جائے اور ساری آبادی کو راشن کیا جائے لیکن اس میں بڑی عملی دشواریاں ہیں اور شاید وسیع و دراز ملک خصوصاً ایسے ملک میں اس کا امکان نہیں جہاں حمل و نقل کی خاطر خواہ سہولتیں نہیں ہیں جیسے ہندوستان کا حال ہے۔ اور نہ اتنا عملہ اتنی آسانی سے مہیا کیا جا سکتا ہے جو کروڑوں کاشتکاروں کی پیداوار کا صحیح حساب کریں۔ ان مشکلات کے پیش نظر اور مقامی حالات پر غور کرنے کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ چاول کو جس کی یہاں بہت کمی ہے اجارہ داری کے اصول پر خریدنے کا انتظام کیا جائے اور باقی اجناس کی حد تک لیوی کے علاوہ ضرورت ہو تو بازاروں سے خریدنے کی کوشش کی جائے۔ خود چاول بھی لیوی کے تحت خریدا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک پابندی اور بھی عاید کی گئی ہے کہ لیوی کی ادائی کے بعد بھی اگر کاشتکار فروخت کرنا چاہے تو بجز حیدرآباد کوآپریٹیو کارپوریشن کے اور کسی کو فروخت نہیں کر سکتا۔ خرید و فروخت کی یہ جو تدابیر ہیں یہ فوری صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی بھی تھیں لیکن حکومت سرکار عالی نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ زرعی پیداوار کی نکاسی کا انتظام ایک ایسے طریقہ پر لایا جائے جس سے کاشتکار کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو۔ وہ طریقہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ امداد باہمی اصول پر عمل کیا جائے اور ایسی امدادی انجمنوں کو فروغ دیا جائے جو کاشتکاروں کے معاشی [illegible] سب سے زیادہ مقدم سمجھیں اور درمیانی [illegible]

بقیہ صفحہ نمبر ۱۰

عرب لیگ، اس کی تشکیل اور تاریخی پس منظر

از عبدالرحمن صدیقی ایڈیٹر "مارننگ نیوز"

(۲)

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں برطانیہ مخالفت کے اتحاد عرب کا تصور رکھنے کبھی پسند نہیں آیا۔ ممالکِ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کو جنم دیے ہیں سامراجی طاقتوں کو دیر تک حاجتی لیکن ایک نیشنلزم بنا کر وہ ایک ہی نقطہ پر ان کو جمع کر سکتے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ غور تھا کہ آیا اس اسکیم کے مذہبی پہلو پر زیادہ زور دینے سے عرب ممالک دوسرے اسلامی ممالک اور قوموں سے الگ تو نہیں ہو جائیں گے۔ ترکی ایران اور افغانستان عرب نہیں ہیں پھر بھی ماقبل جنگ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے میثاق سعد آباد میں شرکت کی تھی۔ اس اسکیم کے خاص مذہبی پہلو کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا ہے کہ کیا عرب لیگ اپنی سرگرمیوں کو صرف ان ملکوں تک محدود رکھتی ہو اس کے رکن ہیں یا اس کے دائرہ عمل میں تیونس، الجیریا اور مراکش وغیرہ بھی آ جاتے۔ عرب ممالک کے قائدین وزراء اعلیٰ عہدہ داروں سے جب میں نے تبادلہ خیال کیا تو مجھے یقین دلایا گیا کہ جب ایک بار عرب لیگ مضبوط ہو جائے گی تو تمدنی، تعلیمی اور صحافتی میدان میں اس کی سرگرمیوں کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکے گی۔

قاہرہ کانفرنس ایک سے زیادہ اعتبارات سے کامیاب رہی۔ اس کے ابتدائی محرکین اس کو ایک تحت جماعت بنانا چاہتے تھے۔ لیکن نتیجہ ویسا ہی نکلا۔ سان فرانسسکو میں عرب نمائندوں نے جن کی قیادت شام کے عیسائی وزیرِ اعظم فارس بے الخوری کر رہے تھے ان واقف لوگوں پر گہرا اثر ڈالا جو وہاں جمع تھے۔ عرب لیگ نے جو اسپرٹ پیدا کر دی تھی اس نے عربوں کو متحد رکھا، وہ ہم خیال اور ہم آواز تھے۔ سان فرانسسکو سے زیادہ عرب ممالک نے لبنان اور شام میں فرانس کے منافیت سوز حرکات کے خلاف اپنا متحدہ محاذ قائم کیا اور فرانس کو اپنی فوجیں ہٹا لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ کامیابی آئندہ کے لئے ایک خوش آئند علامت ہے۔ عرب لیگ کے دستور کا منشاء محض سیاسی میدان میں کام شروع کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تمدنی اور تعلیمی سرگرمیوں کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ ایک قسم کا مشترکہ نظام زر قائم کیا جائے۔ تبادلہ کے لئے کوئی بہتر طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ تجارتی اشیاء کی آمد و رفت میں سہولت پیدا کی جائے اور جہاں تک عوام کی ابتدائی ضروریات کا تعلق ان ملکوں کو خودکفیل بنا دیا جائے۔ اتحادی اقوام نے اپنی تعداد میں اضافہ کرنے کی خاطر عجلت سے کام لیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کو دھمکی دی کہ اگر انھوں نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا تو ان کے تصفیوں میں ان کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اس واقعے نے عرب لیگ کو سیاسیات میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد فرانس کے مظالم شروع ہوئے۔ ان مظالم کو خاموشی سے برداشت کر لیا عرب اتحاد عرب لیگ کے بلند بانگ دعووں کے بعد بڑی ذلت کی بات ہوتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ عالمی صیہونیت امریکہ کے توسط سے انگلستان کو اس بات پہ مجبور کر رہی تھی کہ انگلستان نے فلسطین میں یہودیوں کی مزید توطن پذیری اور یہودیوں کے ہاتھ (جو ابتدائی تنظیم و نسق کے آمراد حصہ دار تھے) یا ان کے ذریعہ عربوں کی اراضی کی فروخت کو روک دینے کے جو وعدے کئے تھے ان سے انحراف کیا جائے۔ عرب لیگ یہودیوں کی مزید توطن پذیری اور فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کے خلاف ہے۔ اگر پریسیڈنٹ ٹرومن یا برطانیہ کی عمالی کابینہ عربوں کو ایسا ناجائز فیصلہ قبول کرنے پر مجبور کرے تو عرب اس کی مخالفت کریں گے اور ضرورت ہوگی تو مسلح قوت استعمال کریں گے۔ عرب لیگ کی موتمری فلسطین میں زمین خریدنے کے لئے چندے جمع کر رہی ہے تاکہ یہ زمینات یہودیوں کے ہاتھ میں جانے سے بچ جائیں۔ اس غرض کے لئے عرب ممالک نے تخمیناً بیس لاکھ پونڈ کے وعدے کئے ہیں۔ اور یروشلم کے دو بینک یعنی عرب بنک اور امہ بنک اس کام میں کافی امداد دے رہے ہیں۔ یہ مسائل غیر متوقع طور پر سامنے آ گئے ہیں اور بلا تاخیر ان کا حل دریافت کرنا ہے۔

بہر حال اس کو یہ مطلب نہیں کہ اتحاد عرب کا تمدنی، تجارتی، یا دوسرا پہلو نظرانداز کر دیا جائے گا۔ حالاتِ جنگ سے حالاتِ امن کی طرف تبدیلی میں ذرا دیر ضرور ہوگی۔ یہ امر ضروری ہے کہ فرانس اور شام کی نزاع کا خوش اسلوبی سے تصفیہ کر دیا جائے اور عرب علاقوں سے فرانسیسی اور برطانوی فوجیں ہٹا دی جائیں۔ اگر عرب لیگ یہ کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے گھر کی حالت درست نہ کر سکیں اور بیرونی طاقتوں سے دوستانہ تعلقات قائم نہ کر سکیں بشرطیکہ بیرونی طاقتیں بھی خلوص سے پیش آئیں۔

یوروپین ممالک اور امریکہ کی تجارتی رقابت سے عرب اتحاد کو خطرہ ہے۔ موصل، ایران اور الحسا کے تیل چشموں پر اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ممکن ہے کہ یہ طاقتیں آپس میں کوئی ناپاک معاہدہ کر لیں اور عرب ممالک کی آزادی کو کچل دیں۔ موصل کے تیل کا پائپ عراق، شام، لبنان اور فلسطین سے ہو کر گزرتا ہے۔ مجوزہ امریکی پائپ لائن جو خلیج فارس سے بحر روم تک جائے گی وہ غالباً "ماورائے جوردان" اور فلسطین سے گزرے گی۔ اگر اس کا نقطہ اختتام غازا یا اسکندریہ میں قائم کیا گیا تو اس کے راستہ میں صحرائے جزیرہ اور نیل کے ڈیلٹا کو بھی شامل کر لیا ہوگا۔ اہواز اور بحرین کے تیل پر برطانیہ کی اجارہ داری اور الحسا، نجد اور غالباً حجاز کے ذخائر پر امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ روس ناراض ہے۔ اس کے پاس قفقاز، کوبان اور سائبیریا میں اس وقت جتنا تیل موجود ہے اور آئندہ جس قدر امکان ہے وہ ساری دنیا کے مجموعی ذخیرے سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود اس نے ایران کے تیل کو ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے۔ روس کو تیل کی خواہش ہے۔ خلیج فارس کے سمندر کی! موصل کا تیل فرانس اور برطانیہ کے قبضہ میں ہے اس کے بعد ڈچ اسٹانڈرڈ کمپنی کی حیثیت ہے۔

خواہ عالمی امن کے علمبردار ایک ٹیم کی طرح تیل پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کریں یا تیل کے حصول میں نفسی نفسی کا معاملہ ہو بہرحال دنیائے عرب اور عرب لیگ کے لئے ایک خطرہ ہے۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنی مشترکہ مرضی عربوں پر مشترکہ طور پر مسلط کرنے کی کوشش کریں اور دوسری صورت میں ممکن ہے کہ سازشوں، شرارتوں اور معمولہ طریقوں کی پرانی ترکیبوں سے عربوں کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔ ضرورت ہے کہ عرب ہوشیار رہیں اور سازشوں اور ترغیب کے مقابلہ میں اپنے اتحاد کو برقرار رکھیں۔ عرب ممالک کو اپنی اصلاح اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ تیل کے محاذ پر متحد طور پر جمے رہیں ——— مجھے امید ہے کہ اس کا امکان ابھی باقی ہے ——— تو وہ اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں گے اور مشرق وسطیٰ کو بربادی سے بچا سکیں گے۔ عرب لیگ عرب ملکوں کو ایک متحدہ محاذ پر قائم رکھ کر ایک بنیادی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

عرب لیگ کی تشکیل اگرچہ جمعیت الاقوام کے نمونہ پر ہوئی ہے لیکن یہ عرب بادشاہوں کی

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

سیاسی نمک پارے

از

کشاف

برائے تنقید

جب مسٹر راجگوپال چاری سے پوچھا گیا کہ اگر کانگریسی حکومت برسرِ اقتدار آجائے تو کیا وہ تمام کنٹرول برخاست کردے گی! ۔ راجہ جی نے کہا کہ کنٹرول ہر زمانہ میں برقرار رہنا چاہئے تو کی حکومت ایک ہمہ گیر کنٹرول قائم رکھے گی ورنہ لوگ ناقوں کا شکار ہو جائیں گے ۔ بدیسی تجارت اور تمام ضروری اشیاء پر کنٹرول کی ضرورت ہے۔ عصرِ جدید کا رجحان یہ ہے کہ منصوبہ بندی اور کنٹرول کے تحت زندگی بسر کی جائے۔ اس سے چھٹکارا نہیں۔ (روزنامہ "ہندو" مدراس)

سوامی راما نند تیرتھ اپنے ایک صحافتی بیان میں کہتے ہیں کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حیدرآباد وفاق ہند میں ایک خود مختار وحدت کی حیثیت سے شریک ہو۔ الفاظ تو بہت نظر فریب ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد حیدرآباد کی خود مختاری کس طرح باقی رہے گی! سوامی جی کے اس بیان کو پڑھ کر ہمیں ایک کہاوت یاد آگئی جو قدم قدم کی لوگوں میں رائج ہے۔

"جڑ کٹے بیل بڑھے"

ایک مراسلہ نگار نے تحریر کیا ہے کہ:-

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" پہ ہم میں سے اکثر ناز ان کے کہ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کو بہت اچھے انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے ۔ لیکن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں علی سردار جعفری کی تنقید سننے کے بعد اکثروں کا مغالطہ رفع ہوگیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں "روح اقبال" کے مصنف کی حیثیت سے قابل ستائش نہ ہوتی کیا! ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی تو ہیں۔ کیا یہ عظمت ان کے لئے کافی نہیں۔

علی سردار جعفری نے اپنے مقالے میں مولوی سید عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات کی جسارت آمیز خامہ فرسائی کا جس انداز میں ذکر کیا اس سے سامعین کے قلوب میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ عبدالواحد صاحب کا اقبال کے کلام کو سراہنا ایک تحسین ناشناس ہے۔ (دروغ برگردن راوی)

ہم آج تک نہ سمجھ سکے کہ مولوی عبدالواحد صاحب نے جنگلات سے جنگ کر اقبالیات کی راہ کیوں اختیار کی! ہوگی ان کی کوئی مصلحت۔ ہیں کیا! علی سردار جعفری صاحب انہیں معصوم اور بے ضرر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تو بہتر تھا۔

علی سردار جعفری صاحب نے مولوی عبدالرزاق صاحب راشد (ایم۔ اے) بی ایس کی اس کتاب کا بھی ذکر اپنے مقالہ میں کیا جو کلیات اقبال کے نام سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کے متعلق ہمارے ایک دوست کی تنقید یہ ہے کہ اگر دیباچہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو کتاب بڑی اچھی ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک نے ہندوستان میں جس عورت کو جنم دیا اس کا مجموعی نام عصمت چغتائی ہے۔ (ابراہیم جلیس)

ہمیں یہ تعریف بہت پسند آئی۔

فحش نگاری کے خلاف سجاد ظہیر کی قرارداد کو ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس نے مسترد کر دیا۔ (ایک خبر)

اگر حقیقت نگاری فحش نگاری ہے تو سجاد ظہیر کی قرارداد ہماری نظر میں رجعت پسندانہ تھی۔

رواداری شہری آزادیوں کی روح ہے۔

(ٹائمز آف انڈیا)

بالکل غلط ہے۔ ہمارے پنڈت تو بے لگامی کو شہری آزادیوں کی روح سمجھتے ہیں۔

خاکساروں کے جلسہ میں لیگی غنڈوں کا ہنگامہ۔

(شیر دکن کی سرخی)

اور جب کانگریسی حضرات کمیونسٹوں کے جلسوں میں ہنگامہ برپا کرتے ہیں تو انہیں محبان وطن کہا جاتا ہے۔

مولوی ابوالحسن سید علی صاحب کی صدارت میں ریلوے کے مسلم ملازمین کی ایک انجمن تشکیل دی گئی۔ (ایک خبر)

ہم اب تک یہ نہ سمجھ سکے کہ ریلوے کے ہندو اور مسلم ملازمین کے مفادات میں تصادم ہے یا مسلم لیڈروں اور ریلوے یونین کے لیڈروں کے مفاد میں تصادم ہو رہا ہے؟

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس پر مخالفانہ تنقید کرتے ہوئے معاصر رعیت نے تحریر کیا ہے کہ ہم اپنے ترقی پسند ادیبوں سے صرف یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ حالیہ جنگ جس نے اس ملک کی معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو کیوں متاثر نہ کر سکی؟

معاصر موصوف ایک زمانہ میں خود ترقی پسند خیالات کا حامل تھا مگر خدا بھلا کرے جماعتی سیاست کا کہ وہ ترقی پسندوں کے خلاف محاذ تیار کرنے میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر مرید نارائن ریڈی آندھرا کانفرنس میں گھستے اور نہ معاصر موصوف کو قلابازیاں لگانا پڑتا۔

ہندوستان کی فوری آزادی اور مساویانہ شہری حقوق کے مسئلہ پر کانگریس انتخابات میں شریک ہو رہی ہے اس کے لئے "ہندوستان چھوڑ دو" کانگریس کا نعرۂ جنگ ہوگا۔ (پنڈت نہرو)

گویا پنڈت جی اب نعروں سے ایٹم بم کا کام لینا چاہتے ہیں۔

سچ۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

سنہ ۱۹۴۲ء کی سخت آزمائش کے بعد قوم زیادہ طاقتور ہوگئی۔ (راجندر پرشاد)

اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ساری کی طاقت سے لڑنے کے بجائے قوم الیکشن لڑ رہی ہے۔

بہار اڑیسہ میں شدید طوفان۔

(اخباری سرخی)

کیا پنڈت نہرو کو اڑیسہ ہو گئے؟

فلسطین میں امریکی سرمایہ داروں کی سازش

اور تین چار ہفتوں سے فلسطین میں بڑی نازک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ یہودی چاہتے ہیں کہ انہیں فلسطین میں آکر بسنے کی پوری آزادی دے دی جائے عربوں کا خیال ہے کہ اس طرح یہودی کچھ دنوں میں فلسطین کی معاشی اور سماجی زندگی پر چھا جائیں گے اور اس چھوٹے سے ملک میں عربوں کی قومی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔

چنانچہ اس وقت یہودی اور عرب دونوں تم ٹھونک کر میدان میں نکل آئے ہیں اور ابھی اس انتظار میں ہیں کہ برطانوی حکومت کا فیصلہ شائع ہو جائے تو اس کے بعد اگلا قدم اٹھائیں۔ عرب ملکوں میں یہودیوں کے خلاف بڑے زبردست مظاہرے ہوئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی غیر قانونی فوجیں فلسطینی عربوں سے لڑنے کے لئے تیار کھڑی ہیں۔

یہودیوں سے فلسطینی عربوں کی یہ بدگمانی اور نفرت بے بنیاد نہیں۔ یہودیوں کی یہ آرزو کہ وہ فلسطین آکر آباد ہوں بہت پرانی ہے اور ہر روز صبح و شام وہ خدا سے یہی دعا مانگا کرتے ہیں۔ مگر ان کی اس آرزو کو عملی جامہ انگریزوں نے پہنایا اور اس غرض سے پہنایا کہ ان کی مدد سے عربوں کی بڑھتی ہوئی تحریک آزادی کو کمزور کیا جائے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد جب یہودی فلسطین میں بسائے جانے لگے تو عربوں نے یہی سمجھا کہ ان کی تحریک آزادی کو کچلنے اور ان کی ہستی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے انگریزوں کی طرف سے یہ فتنہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔

فلسطین میں آج یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ یعنی پوری آبادی کی تقریباً ایک تہائی ہے۔ لیکن ان کا اثر و اقتدار اپنی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ فلسطین کی بہترین زمینیں یہودیوں کے قبضہ میں ہیں جن پر وہ اجتماعی کھیتی کرتے ہیں۔ یہودیوں نے نئے نئے کارخانے کھولے ہیں، نئی صنعتیں قائم کی ہیں، نئے شہر بسائے ہیں۔ لیکن یہودیوں کی ان سرگرمیوں سے عربوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ الٹا نقصان ہوا۔ یہودی اپنے کھیتوں اور کارخانوں میں عرب مزدور نہیں رکھتے تھے کہ یہودی مزدوروں نے اپنی جو ٹریڈ یونین یعنی ہستادروت قائم کی ہے اس میں عرب مزدور شریک نہیں ہو سکتے۔ فلسطینی عربوں کے قوم پرور رہنماؤں نے ان کی قومی تحریک نے ابتدا ہی سے یہودیوں کے آنے اور بسنے کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ ۱۹۲۹ء تک ان کی یہ مخالفت نے اتنا زور پکڑا کہ برطانوی حکومت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ حالات کی چھان بین کے لئے کمیشن مقرر کئے گئے۔ ایک کمیشن نے سفارش کی کہ فلسطین کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک میں یہودی ہوں اور دوسرے میں عرب لیکن اس تجویز پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوا۔ آخر میں برطانوی حکومت نے ۱۹۳۹ء میں یہ طے کیا کہ پانچ سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء کے بعد یہودیوں کو فلسطین آنے اور بسنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جنگ کی وجہ سے عملاً یہودیوں کا آنا ۱۹۴۵ء سے بھی بند ہو گیا۔

آج یہودیوں کی تمام کوششوں کا مقصد یہی ہے کہ برطانوی حکومت سے اس فیصلہ کو منسوخ کرائیں۔

لیکن جنگ کے گزشتہ پانچ برسوں میں برطانیہ فلسطینی عربوں اور یہودیوں کا آپس کا تعلق بالکل بدل گیا ہے۔ یہودیوں کو فلسطین میں انگریزوں نے بسایا تھا مگر آج ان کے سرپرست انگریز نہیں بلکہ امریکی حکومت ہے۔ اس جنگ کے دوران میں امریکہ کے یہودی سرمایہ داروں کی دولت اور طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب وہ انگلستان کے یہودی سرمایہ داروں کے مقابلہ میں زیادہ بااثر اور بااقتدار ہیں۔ اس لئے برطانیہ کے سامراجیوں کو خطرہ ہے کہ فلسطین پر یہودی پوری طرح چھا گئے تو اس سے امریکہ کے یہودی سرمایہ دار اور بالآخر امریکی حکومت فائدہ اٹھائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت اب فلسطین کو بالکل یہودیوں کے ہاتھ میں دینے پر آمادہ نہیں۔

چنانچہ انگریزوں نے یہودیوں کے بجائے اب عربوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ انگریز اب یہ چاہتے ہیں کہ عربوں کو راضی رکھ کر فلسطین اور دوسرے عرب ملکوں پر کسی نہ کسی صورت میں اپنا قبضہ رکھیں اس مقصد کے لئے وہ در پردہ مفتی فلسطین امین الحسینی کو بھی ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات اہمیت سے خالی نہیں شرق اردن کے امیر عبداللہ نے ابھی ہماری دنیا جانتی ہے کہ انگریزوں کا آلہ ہے فلسطین کی عرب ہائی کمیٹی دوبارہ قائم کر دی ہے اور اس کمیٹی کے صدر کی جگہ مفتی اعظم فلسطین کے لئے خالی رکھی ہے۔

دوسری طرف امریکی حکومت یہودیوں کی حمایت کر رہی ہے اس کی بھی وجہیں ہیں۔ ایک طرف تو امریکہ کے بڑے بڑے یہودی سرمایہ داروں کا دباؤ ہے۔ دوسرے امریکی سرمایہ دار عرب ملکوں (سعودی عرب) میں تیل کے چشمے ٹھیکے لیتے ہیں۔ وہ تیل پائپ کے ذریعہ فلسطین کی بندرگاہ حیفا آتا ہے اور وہاں سے جہازوں کے ذریعہ امریکہ جاتا ہے۔ اس سے امریکی حکومت یہ چاہتی ہے کہ فلسطین سے برطانوی اثر و اقتدار کو ختم کرکے اپنا اقتدار قائم کرے یہ اسی وقت ممکن ہے جب فلسطین پر یہودی حاوی ہو جائیں کیونکہ وہ امریکی حکومت کے زیر اثر ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عربوں کے جھگڑے کی نوعیت آج وہ نہیں رہی جو اس جنگ سے پہلے تھی۔

آج یہودیوں اور عربوں کی لڑائی دراصل انگریز اور امریکی سرمایہ داروں کی لڑائی ہے۔ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کو لڑا کر انگریز اور امریکی اپنا اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہودی اور عرب عوام کو سوچنا ہے کہ وہ کب تک اس طرح ان کا آلہ کار بنے رہیں گے؟

انگلستان کی مزدور وزارت چاہتی ہے کہ اس مسئلہ کو اتحادی اقوام کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اگر خود عربوں اور یہودیوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا تو اتحادی اقوام بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گی۔ عربوں اور یہودیوں میں اتحاد ہو جائے تو سامراجی ممالک انہیں لڑا کر اپنا الو سیدھا نہیں کر سکیں گے اور نہ صرف فلسطین بلکہ تمام عرب ملکوں کی آزادی کا دن بہت قریب آ جائے گا۔

عرب لیگ، اس کی تشکیل اور تاریخی پس منظر

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۵)

لیگ ہے۔ شاہ فاروق سے سلطان ابن سعود، فیصل، امام یحییٰ، اور امیر عبداللہ اپنے وزرا اور نمائندوں کے ذریعہ اس ادارہ پر حکمرانی کریں گے۔ عرب قوم یا عرب اقوام قومی حیثیت سے صرف ایک اقلیت کا درجہ رکھتی ہیں جو شام اور لبنان کی جمہوریتوں اور فلسطین کے عربوں کی پر جوش جماعت کے نمائندوں پر مشتمل ہے کچھ عرصہ سے عرب ممالک قومی رجحانات سے زیادہ شاہی رجحانات کارفرما رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ حالات باقی رہیں گے یا عرب لیگ کے فیصلوں پر عوام کا بھی اثر پڑے گا۔ اگر بادشاہ اور وزیروں کے ساتھ عوام کا بھی تعلق پیدا ہو جائے تو سلطنت کو زوال آ سکتا ہے۔

جدید مملکت پر اقبال کی تنقید

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

سلسلہ گزشتہ

نسل، زبان، سیاسی اور معاشی وحدت اور رسوم و روایات کی یکسانیت وطنیت کے جذبہ کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی عنصر بھی اجتماعی زندگی کی اساس نہیں کہا جا سکتا جس کے بغیر کسی گروہ کی معنوی تنظیم محال ہو۔ در اصل وطنیت کا جذبہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات سے پیدا ہوا۔ اس کی عمر دو سو ڈھائی سو برس سے زیادہ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس دوران میں اس نے بے پناہ قوت حاصل کر لی ہے۔ وطنیت اس قوت کو نہایت ہی پست مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتی۔ اس نے من مانے طور پر اپنے اقدار حیات بنائے ہیں جنھیں وہ حق و باطل کا معیار خیال کرتی ہے۔ اس اندھے جذبہ کے تحت قومیں یہ بھول گئیں کہ جس طرح انفرادی زندگی میں خواہشوں اور میلانوں کی تحدید سے اخلاق و تمدن پیدا ہوئے۔ اس طرح جب تک قومیں اپنے اعمال پر تحدید عائد کرنا نہ سیکھیں گی اس وقت تک یہ دنیا اسی طرح جہنم زار بنی رہے گی جیسی کہ آج کل بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے قدیم آریاؤں، یونانیوں اور جاہلیت کے عربوں میں اس قسم کے تصورات ملتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بولنے والوں کے علاوہ دوسروں کو گونگا سمجھتے تھے۔ اس قسم کی فوقیت کا احساس اسلام سے قبل اکثر گروہوں میں موجود تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے ان نسلی اور نسبی فضیلتوں کو معدوم قرار دیا۔ جن کی وجہ سے شرافت اور بزرگی کسی خاص قبیلہ یا گروہ کی طرف منسوب ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ اس نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کہہ کر انفرادی اعمال کو شرف و احترام کا مستحق ٹھہرایا۔ نہ کہ نسلی و نسبی تعلق کو۔ اسلامی روایات میں وسیع تر انسانیت کا تصور پیش نظر رہا ہے نہ کہ مخصوص اور محدود گروہوں کا۔ مخصوص گروہ تو اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ آپس میں پہچانے جا سکیں۔ جیسا کہ آیت شریفہ میں ہے۔

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ
وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور پھر تمہاری گوتیں قبیلے بنائے۔ تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے)

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلعم نے نسل و نسب کے تفاخر کا سلسلہ قوموں میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جبکہ آپ نے فرمایا۔ لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم و آدم من التراب۔ (یعنی) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔

اقبال نے اسلام کے رنگ و نسل و قوم سے بالاتر ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ وطنیت کے جذبہ کو جو ایک انسان اور دوسرے انسان میں مصنوعی فرق قائم کرتا ہے۔ بت پرستی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی فکر بت گری اور بت پرستی کی ایسی خوگر رہی ہے کہ جب تک ایک بت ٹوٹ جاتا ہے وہ دوسرا بت تراش لیتی ہے۔ نئے نئے بت تراشنے کا سلسلہ قدیم زمانے کی طرح آج بھی جاری ہے۔ ان بتوں کی چاہے شکلیں کچھ تھوڑی بہت بدل گئی ہوں۔ مگر ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ آج انسانی گروہوں نے وطنیت کا نیا بت تراشا ہے۔ جس کے آگے وہ سربسجود ہیں۔ اس بت پر بلا تکلف و تامل انسانیت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح دوسرے بت ٹوٹ گئے ضرور ہے کہ اس بت کو بھی توڑا جائے۔ تاکہ انسانیت کی گلو خلاصی ہو۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است
تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیش پائے ایں بت ناارجمند
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل
گرمی خونت ز صہبائے خلیل
بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ہو بزن

اسلام کی قدیم روایات ہمیشہ وسیع تر انسانیت کے حقوق کی علمبردار رہی ہیں نہ کہ مخصوص گروہوں کے مادی معاشی مفاد کی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے آپ کے خاندان کی نسبت جب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا تھا: "سلمان ابن اسلام" یہ جواب ایک شخص کا جواب نہیں بلکہ ایک مذہب کا جواب ہے جو اس نے زندگی کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے دیا تھا۔ اقبال نے اسی واقعہ کو اپنے اس شعر میں نقل کیا ہے۔

فارغ از باب و ام و اعمام باش
ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

جس طرح اسلام نے خاندانی شرف کو معدوم کر دیا اسی طرح سے آب و گل کی فضیلت کو بھی جس سے وطنیت عبارت ہے اپنے نظام اخلاق میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کا جس سرزمین سے تعلق ہوتا ہے اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز اسے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ انسانی روح خاک کی پستیوں میں اپنے تئیں ایسی آلودہ کرے کہ اس کی قوت پرواز جاتی رہے۔ ہندی، ایرانی اور تورانی کے امتیازات سے بالاتر ملت اسلامی کی روحانی ہستی ہے جو کسی خطۂ زمین میں مقید نہیں ہو سکتی۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

دوسری جگہ کہا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ہندی اور تورانی ہونے سے پیشتر آدمی آدمی ہوتا ہے۔ اس کی آدمیت کسی خطے سے وابستہ ہونے سے پہلے ہی وجود میں آتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں پہلے تو آدم بے رنگ و بو ہوں۔ اس کے بعد جو چاہو نام رکھ لو۔

چو از بند آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم
از آں پس ہندی و تورانیم من

اقبال وطن دوست ہے لیکن وطنیت سے بیزار ہے۔ وہ اس کو اسلام کی عالمگیریت کے منافی تصور کرتا ہے۔ اس مسئلے پر اس نے مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں تفصیل سے وطنیت کے غلط پہلوؤں پر بحث کی تھی۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی

کہ امن، سلامتی اور ان کی موجودہ باہمی بستیوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام منظر میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار دیا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین پرائیوٹ معاملہ ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ "دین" نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی اور نہ پرائیوٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم و نسل پر بنایا نہیں جا سکتا۔ نہ اس کو پرائیوٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا روم نے

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہندوستان کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اقبال کے بعض اشعار سے ناواقف لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ وہ فلسفۂ نطشے کو علم فلسفہ کا اعلیٰ سمجھتا ہے اس لئے اس کے نزدیک قوی اقوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کمزوروں کو اپنا غلام بنائیں لیکن شارح اقبال کے بعض اشعار سے یہ غلط نتیجہ اس لئے نکالا گیا کہ وہ بے عملی اور کمزوری کو انسان کی سب سے بڑی لعنت خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مظلوم بھی ایک طرح کا ظالم ہے کہ وہ دوسروں کو ظلم کرنے کا موقع دیتا ہے۔ دراصل اس کی دلی تمنا ہے کہ کمزور جماعتیں اپنی کمزوری اور بے بسی چھوڑ کر زبردست بن جائیں تاکہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" اور دوسرے کلام میں کمزوروں کو طاقتور بننے کا طریقہ بتایا۔ لیکن وہ اس طاقت کو مطلق اور بے قید نہیں دیکھنا چاہتا انسانیت اور اخلاق کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔

اقبال ملوکیت یا امپیریلزم کو جارحانہ وطنیت ہی کا ایک شاخسانہ تصور کرتا ہے اور اس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم کی ضد خیال کرتا ہے۔ قومیت کے علمبردار کا نظریہ "میرا وطن غلط ہو یا صحیح؟ حق ہے" یہ جھوٹی وطنیت حق و باطل میں تمیز نہیں ہونے دیتی۔ جب آدمی سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اور اپنے عمل کو حق بجانب خیال کرتا ہے۔ جدید ملوکیت اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے جس طرح سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کے لئے نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی طرح ملوکیت جو وطنیت ہی کی ایک شکل ہے۔ نئے نئے علاقوں کو فتح کر کے اپنا پھریرا لہرانا چاہتی ہے اور اپنے اقتدار کے حدود دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع کرنے کی متمنی رہتی ہے۔ اس کو اپنا اقتدار وسیع کرنے سے کام ہے خدا کی بے بس مخلوق پر کچھ ہی گذرے۔

آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء سال نو کے موقع پر اقبال نے جو پیغام دیا تھا اس کا ایک ایک لفظ انسانیت دوستی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ اس پیغام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوت کے استعمال کو صرف اسی وقت جائز سمجھتا ہے جبکہ وہ اخلاقی مقاصد کے لئے ہو نہ کہ جوع الارض کے لئے۔ اس پیغام کے الفاظ یہ ہیں:۔

"دور حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے۔ اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے آج زمان و مکاں کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی ہے۔ وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسانوں کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس واسطے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچایا جائے۔

انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خونریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا کہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔ جو سال گذر چکا ہے اس کو دیکھو اور نو روز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش یا ہسپانیہ ہو یا چین ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے ترقی انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال جنگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا یہی انجام ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور تا

غذا کے مسائل

بقیہ سلسلہ صفحہ (۴)

نفع اندوزی کو روکیں جو ایک طرف کاشتکاروں کے لئے اور دوسری طرف صارفین کے لئے یکساں مضرت رساں ہے۔ ان اتحادی انجمنوں کے ذریعہ نہ صرف کارپوریشن کے لئے غلہ حاصل کرنا مقصود تھا بلکہ ایسے اضلاع میں جیسے نلگنڈہ، محبوب نگر وغیرہ جہاں جوار درآمد کی جاتی ہے وہ ان کے حوالے کی گئی تاکہ ایک واجبی منافع کے ساتھ صارفین کو فروخت کریں۔ ایسی انجمنوں کا قیام تقریباً ہر تعلقہ میں ہو چکا ہے۔ حالات زمانہ نے اگر اس کا ساتھ دیا تو توقع ہے کہ عنقریب یہ انجمنیں اس قابل ہو جائیں گی کہ اپنے علاقہ کے تمام کاشتکاروں کی تقاوی کا انتظام کر سکیں۔ اگر ایسا ہو سکا تو ہمارے ملک کے کاشتکاروں کے لئے اس سے زیادہ مفید چیز نہیں ہو سکتی۔ تفصیلی تحقیقات کی گئی جس سے تو پتہ چلے گا کہ خود کاشتکار کو ایک جنس کی جسے وہ پیدا کرتا ہے کیا قیمت ملتی ہے اور وہی جنس بازار میں کس دام پر فروخت ہوتی ہے۔ سرسری تحقیقات جو اس سلسلہ میں کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کاشتکار کو جوار، باجرہ وغیرہ کی قیمت اس قیمت کے جو صارفین ادا کرتے ہیں (۵۰) فیصد تک ملتی ہے اور چاول کے کاشتکاروں کو (۶۰) فیصد سے زیادہ قیمت نہیں ملتی۔ دلالی منافع کروڑوں روپیہ کا ہر سال جبکہ فصل پر ہوتا ہے دلال بچولیے ہڑپ کر جاتے ہیں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کاشتکار کو کس طرح اس کے اپنے منافع سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

میں مسئلہ اغذیہ کی طرف دوبارہ آتا ہوں۔

غلہ کی فراہمی کے بعد دوسرا بڑا سوال اس کی تقسیم کا ہے جس سے منشاء صرف یہ ہے کہ جو بھی غلہ میسر ہو وہ پوری آبادی کو ملے۔ اگر اناج کم ہے تو سب ہی کی خوراک میں کمی ہو۔ یہ نہیں کہ کسی کے پاس دولت ہو تو کھانے کو کافی مل جائے اور دوسرے محروم رہیں اور آدھا پیٹ کھائیں۔ ہندوستان کی مملکت چونکہ غلہ کی کمی ہے اس لئے راشننگ سے بہتر اور کوئی طریقہ تقسیم کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ منشاء تھا کہ جو بھی غذا یہاں ہے وہ سب کو برابر ملے۔ دوکانوں کے سامنے دیکھو لگنے سے جو جھگڑے فساد ہوتے ہیں وہ دور ہوں بلکہ راشننگ کی اسکیم بھی ضرورت تھی کہ خود اپنی تمام ضروریات کا صحیح اندازہ ہو اور اگر ہم باہر کے ممالک سے کچھ غلہ درآمد کریں تو ان کو یہ بتلا سکیں کہ ہم نے اپنی ملکی ضروریات کا تخمینہ کر لیا ہے لیکن غذا کی کمی ہمیں اپنا پیٹ بھرنے نہیں دیتی اور اس کی کمی کو صرف اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ جو ممالک کہ ان کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوں وہ ہم کو دے دیں۔

محض موجودہ پیداوار کی فراہمی اور راشننگ کے ذریعہ اس کی تقسیم مسئلہ اغذیہ کے بنیادی پہلو پر کوئی دیرپا اثر نہیں ڈال سکتے۔ نہ تو اجارہ داری کے اصول کرنے سے اور نہ راشننگ کے ذریعہ غذا کی کمی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ غلہ زیادہ اگانا چاہئے۔ ایسے ملک میں جہاں زرعی پیداوار کا انحصار موسم باراں پر ہو جس کا حال یہ ہو کہ کبھی خوب بارش ہو جائے تو کبھی اصل نہ ہو کبھی موسم پر ابھی بارش ہو تو کبھی غیر موسم میں زیادہ پانی برس جائے۔ غرض ان غیر یقینی حالات کے مدنظر اس لئے بھی کہ روز بروز ہماری آبادی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہ نہایت ہی اہم ہے کہ ہم نہ صرف موجودہ کاشت شدہ زمینات پر زیادہ سے زیادہ غلہ اگانے کی کوشش کریں بلکہ نئے قطعات اراضی کو بھی زیر کاشت لائیں اور اس کے ساتھ ہی ساری زرعی منصوبہ بندی کو اس نہج پر ڈھال لیں کہ غذائی اجناس اور غیر غذائی اجناس کے رقبہ جات میں ایک ایسا تناسب قائم رہے کہ ایک طرف غلہ کی فراوانی ہو اور سب کو پیٹ بھر کھانے کو مل جائے تو دوسری طرف ہماری صنعتوں وغیرہ کے لئے غیر غذائی اجناس مناسب مقدار میں مل جائیں۔

حیدرآباد کی حد تک ۱۹۴۳ء کے مقابلہ میں ۱۹۴۴ء میں بہت کافی رقبہ غیر غذائی اجناس سے منتقل کر کے غذائی اجناس کے تحت آیا تھا لیکن ایک چیز ضرور ہے کہ ایسے اجناس کے بجائے جن کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے (مثلاً سفید جوار، باجرہ) دالوں کی زیادہ کاشت ہوئی جن کی ویسے ہی ملک میں فراوانی تھی۔ اس کے روکنے کی ضرورت ہے اور کاشتکاروں کو بتلانا ہے کہ کن اشیا کی زیادہ ضرورت ہے اور کن اشیا کی نہیں۔ اس کے لئے وقت درکار ہے نہ صرف غذائی اجناس زیادہ پیدا کرنے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ ایسی اجناس زیادہ پیدا کی جائیں جن میں غذائیت نسبتاً زیادہ ہے۔

حیدرآباد کی آبادی کے لئے جو تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ نفوس پر مشتمل ہے تقریباً (۱۵) ہزار ٹن روزانہ غذا درکار ہے یا سالانہ (۲۲) لاکھ (۵۰) ہزار ٹن۔ اگر رقبہ زیر کاشت جو تقریباً ایک کروڑ (۳۰) لاکھ ایکڑ ہے اس سے معمولی پیداوار حاصل ہو تو ہمیں (۲۳) لاکھ ٹن کے قریب جوار، باجرہ، گیہوں اور چاول وغیرہ مل جاتا ہے لیکن اس کا سارا انحصار موسم پر ہے۔ بارش وقت پر ہو اور کافی ہو، فصلوں کو روگ نہ لگے کیڑے فصلوں کو تباہ نہ کریں۔ غرض بہت سارے اسباب ہیں اور جن میں کئی ایسے ہیں جن پر انسان کو کوئی قابو حاصل نہیں ہے جس کی وجہ اچھی فصلوں کا ملنا مشکل ہے۔ ابھی نئے ہیں جو کچھ سالانہ پیداوار

حاصل ہوتی ہے اس کو بہت احتیاط سے صرف کر... ضرورت ہے۔

یہ خیال عام تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی مشکلات دور ہو جائیں گی نہ تو غلہ کی فراہمی کا سوال رہے گا اور نہ راشننگ کو جاری رکھنے کی ضرورت۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ جنگ ختم ہونے کی وجہ سے بہت کچھ حالات بدل رہے ہیں غذا کی کمی اب بھی اپنی جگہ باقی ہے۔ جب تک کافی مقدار میں چاول درآمد شروع ہو اور نقل... اپنی معمولی حالت پر نہ آجائیں اس وقت تک صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی دشوار ہے... کے علاوہ ایک نکتہ نظر یہ بھی ہے کہ اس سار... کی پالیسی سے شدید پابندیوں کو دور کر کے غذا کی... اور اس کی تقسیم پر پوری طرح قابو رکھنا بھی ملک... عام مفاد کے لئے مناسب ہے۔

اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے کہ کونسا... طریقہ سب سے بہتر ہوگا بھی وقت کی ضرورت... تاکہ بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ہم اپنے... مسائل کا مناسب حل معلوم کریں۔

واشنگٹن میں صیانت عالم کے ادارہ کا قیام

لندن ۲۵ اکتوبر۔ اقوام متحدہ... عالمی صیانتی ادارے کے عملاً قیام کی تاریخی... کل رات واشنگٹن میں انجام پائی۔

مسٹر جیمس برنس امریکی وزیر مملکت... ۲۹ اقوام کے توثیقی دستاویزات کو حکومت... کی امانت میں دیتے ہوئے اس تاریخی دستاویز... دستخط ثبت کئے جس کی رو سے اس عالمی... ادارہ کو وجود میں لایا گیا ہے جس اقوام... منشور کی توثیق کرتے ہوئے کل رات دئے... حوالے کئے۔ ان میں روس، سفید روس کی جمہو... ریاستیں یوکرین اور پولستان شامل ہیں۔ ... دستاویزات پر دستخط ثبت کرتے ہوئے مسٹر... نے اعلان کیا کہ آج کا دن دنیا کی تمام امن... قوموں کے لئے ایک یادگار دن ہے۔ اقوام... کا منشور اب تمام قوموں کے قانون کا ایک... بن گیا ہے۔ مسٹر برنس نے یہ استفادہ بھی د... کا فقدان دستاویزات پر نہیں بلکہ اقوام... اس خواہش پر موقوف ہے کہ وہ امن برقر... رکھیں گی۔ مسٹر برنس نے یہ ایقان ظاہر کیا کہ...

اُردو شاعری کی خدمت

بقیہ سلسلہ صفحہ (۳)

مجموعوں میں، رسالوں میں اور بہت کچھ کلام قابل انتخاب ابھی موجود ہے۔ جو آئندہ شائع ہوگا۔ غرض کہ اُردو شاعری کا مستقبل بفضلہ امید افزا نظر آتا ہے۔ رہا کلام کا ذوق و معیار، سو یہ ماحول کے بے شمار اثرات سے بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا دوامی یک رنگی ناممکن ہے اور نامناسب بھی کہ فطرت میں خود تغیرات کا تسلسل ہے۔

اس دوران میں بعض احباب سے تقاضا بلکہ اصرار ہوتا رہا کہ بعد کی شاعری بھی سلسلے میں شامل کی جائے تاکہ انتخابات تا حال مکمل ہو جائے ہر عنوانات مذکورہ کے تحت مزید جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوں۔ خود میرا بھی مدت سے یہ خیال تھا۔ لیکن کثرت کار نے ادھر متوجہ نہ ہونے دیا۔ تاہم اُردو کی خدمت بہرحال واجب ہے اور قصد ہے کہ حضرات شعراء اگر اُردو کی اصلاح و فلاح کی خاطر حسب سابق ازراہ کرم تعاون فرمائیں تو عدیم الفرصتی کے باوجود منتخبات کی مزید جلدیں ترتیب دے دے کر حسب صراحت بالا شائع کی جایا کریں تاکہ اُردو کلام کا انتخاب اس سلسلے کی حد تک محفوظ ہوتا جائے اور اُردو شاعری کی ہمہ گیری، نوعیت و وسعت بھی اجمالی شکل میں ملک کے پیش نظر ہوتی رہے۔ انشاء اللہ۔

حضرات شعراء کے تعاون کی وہی شکل ہے کہ اول تو کلام کے مطبوعہ مجموعے عنایت ہوں۔ جو بعد مطالعہ واپس کر دئے جائیں گے یا ان کی قیمت ارسال کر دی جائے گی۔ البتہ ہدیۃً عنایت ہوں تو دوہری بہت بہت شکریہ۔ دوسرے جو کلام رسالوں میں متفرق شائع ہوا ہو یا جو بیاضوں میں جمع ہو حسب مواد اس کی نقلیں ارسال فرمائی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ واپس نہ ہو سکیں گی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جو بیاضیں دست بدست وصول ہوں۔ ان کو بعد مطالعہ دست بدست واپس کر دیا جائے۔ توقع ہے کہ مستقل تعاون سے ساتھ کلام کی ترسیل اور منتخبات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ع تازہ بتازہ نو بہ نو۔

غرض کہ جوں جوں کلام کافی منتخب ہوتا جائے گا۔ معارف، ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت وغیرہ عنوانات کے تحت ایک ایک جلد ترتیب پاکر تین تین جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی جائیں گی۔ مثلاً ہر عنوان کی جلد ہشتم و نہم وغیرہ۔

جو حضرات ازراہ کرم اپنا کلام ارسال فرمائیں اس کے ساتھ اپنے مکتوب میں اجازت طبع تحریر بھی فرما دیں تو بہتر ہو اور اپنے متعلق ضروری معلومات بھی درج فرما دیں۔ یعنی اپنا پورا نام، اپنا تخلص، اپنا وطن، پتہ اپنی ولادت۔ اگر کچھ کلام شائع ہو چکا ہے تو مجموعوں کے نام اور اشاعت کے مقام تک اور انتخابات کلام کی صورت میں ضروری معلومات متعلقہ جلد کے دیباچے میں درج ہو سکیں۔ جن حضرات کا کلام کسی جلد میں شائع ہوگا۔ ان کی خدمت میں متعلقہ جلد کا نسخہ ہدیۃً پیش ہوگا۔ اگر کسی صاحب کا کلام انتخاب میں نہ آ سکے تو ان سے پیشگی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اور عدم انتخابات سے خدانخواستہ ان کے کلام پر حرف نہیں آیا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ مذکورہ کلام کا علمی و ادبی معیار کے عام فہم معیار سے بلند تر ہو۔

جن حضرات شعراء کے پتے معلوم ہو سکے ہیں یا آئندہ معلوم ہوں گے ان کی خدمت میں یہ معروضہ بذریعہ ڈاک راست پیش ہوگا۔ ایسے حضرات اگر دوسرے پتوں سے مطلع فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا۔ مگر جن حضرات کے پتے معلوم نہ ہو سکیں ان سے عدم ترسیل معروضہ کی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اطلاع ملنے پر وہ خود ہی التفات فرمائیں تو کرم اور بھی زیادہ ہوگا۔

اُردو رسائل و اخبارات سے بھی التماس کی جاتی ہے کہ وہ براہ کرم یہ معروضہ یا اس کا خلاصہ بشرط گنجائش شائع کرکے تعاون فرمائیں۔ توقع ہے کہ یہ استدعا کسی نہ کسی حد تک منظور ہوگی اور صحافت کے ذریعے بھی حضرات شعراء تک عام اطلاع پہنچ جائے گی۔

حامیان اُردو کی خدمت میں اُردو کے ایک ادنیٰ خادم کی یہ ناچیز استدعا ہے۔
گر قبول افتد زہے عز و شرف

بیت السلام حیدر آباد دکن — نیاز مند
[illegible] — محمد الیاس برنی

وشنگٹن میں حیاتیات عالم کے ادارے کا قیام

بقیہ سلسلہ صفحہ (۱۰)

دیگر اقوام متحدہ کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعہ حتی الوسع کوشش کرے گا کہ امن برقرار رہے اور تمام قوموں کی فلاح و بہبود کو آگے بڑھایا جائے (رائٹر)

پنڈت نہرو کی اشتراکیت

بقیہ سلسلہ صفحہ (اول)

اور یوپی میں ایک ایسی وزارت تشکیل دی جس نے کاشتکاروں کے بوجھ کو ہلکا کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ موازنہ کو متوازن کرنا ہے۔ تقریباً یہی حالت دوسری وزارتوں کی تھی۔ ان وزارتوں کی بداعمالی کی داستان اگر قلمبند کی جائے تو اتنی ہی ضخیم ہوگی جتنی کہ پنڈت جی کی خود نوشتہ سوانح

ہری۔ لیکن اب ڈگ اس سارے کھیل کو سمجھ گئے ہیں۔

اعظم پریس چارمینار میں طبع ہو کر دفتر مملکت سانچہ تو پ سے شائع ہوا